جاوید شاہین کی ادبی خدمات (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر محمد یار گوندل☆
نصیر احمد☆☆

Literary contribution of Javed Shaheen

Dr. Muhammad Yar Gondal
Naseer Ahmed

Abstract:

Javed Shaheen is a versatile literary figure in urdu literatue. He is a good poet of the high repute, renowned prose writer of high rank and an excellent translator. His seven collections of works on poetry have been published. More over, three other books on prose and thirteen pieces of translation have taken their place in the market. His services to promote urduliterature can not be forgotten .The subject under discussion in a good critical and analytical review of his poetry and prose. In this topic an attempt is made to establish Javed Shaheen's status in urdu literature ofPakistan.

Key words:

Ghazal, Poem, Translations, Symbol, Socialism

کلیدی الفاظ:

غزل، نظم، تراجم، علامت، سوشلزم

شاعری فرد کے جذبات واحساسات کا نام ہے۔ ہر عہد کا شاعر زمانی و مکانی لحاظ سے اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ ایسی ہی عکاسی جاوید شاہین نے زندگی کے کینوس پر تخلیق کی ہے۔ ان کے کلام میں ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی روداد لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ جاوید شاہین کا شمار اردو کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر غزل گو تھے تاہمغزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی طبع

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا
☆☆ سکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

آزمائی کی وہ مختلف رسائل و جرائد سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۵۳ء تک مظفر علی سیّد کے ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور کے معروف ادبی رسالہ ''راوی'' کی ادارت کی۔ بعد میں اس دور کے ''سویرا'' کے مدیروں ظہیر کاشمیری اور احمد راہی کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔[۱] ان کی غزلیں اور نظمیں ایک عرصہ تک ''سویرا''، ''راوی''، ''ادبِ لطیف'' اور ''نصرت'' کی زینت بنتی رہیں۔ یہ وہ ماہ نامے تھے جن سے انھوں نے اپنے ادبی ذوق کی آب یاری کی۔ ان کے سات شعری مجموعے اور ایک کلیات شائع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے نثر اور ترجمہ نگاری میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی تین نثری اور تیرہ تراجم کی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔

جاوید شاہین نے شاعری کی ابتدا ۱۹۴۹ء میں کی جب وہ گیارہویں جماعت کے طالب علم تھے۔[۲] ابتدا میں بیشتر نوجوان شاعروں کی طرح رومانوی شاعری کرتے رہے لیکن اس کا انھےں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ہجر و فراق کی اختر شماری اور اشک باری انھوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کا ایقان تھا کہ جو بات تجربے میں نہ آتی ہو وہ شاعری میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ جلد ہی اس شاعری سے اکتا گئے اور ایک عرصہ تک خاموش رہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب سماجی اور اقتصادی تضادات نے ایک خوف ناک گھٹن کو جنم دے ا۔ بے انصافی اور بے وقعتی نے شدت اختیار کی تو اس لوٹ کھسوٹ کے عمل کا جاوید شاہین نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ ظلم و تشدد، بے انصافی اور گھٹن ان کے ذاتی تجربہ میں آئی تو انھوں نے انسانی دکھوں اور محرومیوں اوران کے مقابلے میں لوگوں کی امنگوں اور حسرتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک لکھی گئی غزلوں کا انتخاب ان کی شاعری کے پہلے مجموعے ''زخمِ مسلسل کی ہری شاخ'' کے عنوان سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کی ۴۳ غزلیں ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ان کا رجحان غزل کی طرف تھا۔ زمانی اعتبار سے اس مجموعے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ حصہ اول ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کے کلام پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۹ غزلیں ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک کی غزلیں شامل ہیں جن کی تعداد ۱۴ ہے۔ یہ مجموعہ ان کی ذات کی درجہ بندی کو ظاہر کرتا ہے۔ معاشرتی حوالے سے وہ اس مجموعے میں نفرت، بیزاری، بے سمتی، ناانصافی اور خوف کے مظاہر کو درجہ بدرجہ بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

دن رات مکدر سی فضا ساتھ ہے میرے
ٹھہرے ہوئے موسم کی بلا ساتھ ہے میرے (۳)

اسی طرح یہ اشعار:

ستانے کو باہر بلائیں کئی
ڈرانے کو آسیب گھر میں بہت
کہوں کیا کہ ہے سانس الجھی ہوئی
ہوا بند ہے اس نگر میں بہت
اُمید ثمر رکھ نہ شاہیںؔ ابھی
کہ زہر خزاں ہے شجر میں بہت (۴)

ان کا دوسرا موضوع رجائیت ہے۔ وہ زخموں کے ناسور پر امید کی ہری کونپلیں سجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زرد پیڑوں پہ ہرا رنگ ذرا آنے دے
اس طرف بھی نئے موسم کی ہوا آنے دے
جنبش چشم سے گرما دے مرد سرد کا لہو
سُست دریا کو سمندکی صدا آنے دے
شاخِ حالات سے اب جھاڑ بھی دے ترش ثمر
تلخ ہونٹوں پہ کوئی تازہ مزا آنے دے
یوں تو کھاجائے گی ظلمات دل و جاں سب کو
بند کمروں میں کہیں سے تو ضیا آنے دے (۵)

''زخم مسلسل کی ہری شاخ'' کی اشاعت کے بعد جاوید شاہین نے ایک طویل غوطہ لگایا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''صبح سے ملاقات'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ منو بھائی ''آخری نظم کا پیش لفظ'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''۔۔۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک کا عرصہ ہماری قومی زندگی کے کیسے کیسے نشیب و فراز پر محیط ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ وہ لوگ جو خوابوں کی پناہ گاہوں میں سر چھپانے کی بجائے بہتر مستقبل کے سپنے بنتے ہیں جاگتے رہتے ہیں، اونگھنے کی جسارت بھی نہیں کرسکتے، پلک جھپکنے فرصت بھی نہیں پاتے کہ جنبش مژگاں سے ہے۔ چشم تماشا کو حذر، جاگتی آنکھوں

سے شب و روز کی وارداتوں کے مشاہدے نے جاوید شاہین کے سامنے فکر کی نئی راہیں کھولیں اور سوچ کے نئے افق وا کیے۔ ''صبح سے ملاقات'' ایسی ہی فکر انگیز سوچوں کا مجموعہ ہے۔''(۶)

''صبح سے ملاقات'' میں ۲۶ نظمیں اور ۱۲ غزلیں شامل ہیں۔ ایک طویل خاموشی کے دوران جاوید شاہین نے یہ سوچ لیا تھا کہ کیا کہنا ہے مگر یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے کہنا ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے غزل کا پیراہن اسے پورا نہیں آرہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء میں نظم لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ نثری نظم ان کی سوچ کا ساتھ دے رہی ہے اور رنگ و آہنگ اور غیر متوازن حالات کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہے تو پوری سنجیدگی سے نثری نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حسن رضوی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

> ''کوئی بھی فارم ہو وہ کسی نہ کسی جگہ پہنچ کر اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ پھر غالب نے بھی کہا ہے ''کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیان کے لیے۔۔۔''، ''(۷)

''صبح سے ملاقات'' میں شامل تمام نثری نظمیں بہت مختصر عرصے میں لکھیں اور اپنے پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد لکھی گئی غزلوں کا انتخاب بھی شامل کر دیا۔ ان نظموں کے پس منظر میں پہلی بیوی شفقت کی طویل بیماری اور اذیت ناک موت کا صدمہ، سب سے بڑے بیٹے فرقان اسماعیل کی بینائی سے محرومی کے خوف ناک اندیشے کا تجربہ اور گیارہ سالہ ملازمت سے بغیر پنشن کے جبری ریٹائرمنٹ کا روگ شامل ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ان نظموں کا مرکزی کردار وہ خود ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> '' ۔۔۔ شاعری کی صبح کا بھولا جاوید شاہین ۱۲ برس بعد واپس آیا تو اپنے ساتھ ''صبح سے ملاقات'' کی حکایت بھی لایا۔ ۱۹۷۰ء میں اپنی غزلیات کے مجموعہ ''زخم مسلسل کی ہری شاخ'' کی اشاعت کے بعد اس نے بے کاری کی پریشانی اور بیوی کی موت کی صورت میں بہت تلخ ثمر کھائے۔ سو یہ مختصر مجموعہ اس کی ذات کے آشوب کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔''(۸)

''صبح سے ملاقات'' میں جاوید شاہین روحانی شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ ان دانشوروں کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے خواب کھونا نہیں چاہتے، بارشیں رائیگاں جاتی نہیں دیکھ سکتے، دھوپ کی

بے ثمر محنت سے آزردہ ہیں مگر بارش اور دھوپ کی صلاحیتوں سے مایوس بھی نہیں اور اچھے بیج کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ صبح کا استعارہ انھوں نے کم و بیش ہر شعر میں استعمال کیا ہے۔ صبح روشنی کی علامت ہے جو زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی روشنی کا خواب جاوید شاہین بھی دیکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی دکھاتے ہیں۔ یہ خواب کم مایہ نہیں بلکہ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کا یہ صحت مندانہ رویہ جابجا اشعار کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ''میں کیسے مان لوں'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

بے روزگاری کی طویل فرصت میں
میں نے بہت کوشش کی
لیکن میرے خوابوں نے
میرے مفاد کی خاطر
مرنے سے انکار کر دیا
تب مجھے خیال آیا
زندگی کوڑے کے ڈھیر پر کھیلنے کے لیے نہیں
دنیا پر بے چہرہ لوگوں کی حکومت ہے تو کیا
میں پیٹ کو اتار کر
کھونٹی پر لٹکا دوں گا (۹)

جاوید شاہین کا تیسرا شعری مجموعہ ''محراب میں آنکھیں'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۴۹ غزلیں اور ۳۶ نظمیں شامل ہیں۔ یوسف کامران اور فیض کی وفات پر انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ بھی اسی شعری مجموعے کا حصہ ہیں۔ یہ مجموعہ علامتی انداز کا حامل ہے۔ آنکھیں خواب دیکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ایسے خواب جو زندگی سے بھرپور اور اپنی ذات میں مکمل ہوتے ہیں، ان کی شاعری میں بڑے واضح نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

اس کے لیے آنکھیں در بے خواب میں رکھ دوں
پھر شب کو جلا کر انھیں محراب میں رکھ دوں
ضرورت ہے یہی، اب تو گزرتا ہے یونہی وقت

جس بات کو دل چاہے اسے خواب میں رکھ دوں (۱۰)

اسی طرح نظم "میں نے رات سے پوچھا" سے ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو جس میں وہ ان خوابوں کے چوری ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں:

میں نے رات سے پوچھا
"میرے گھر سے چوری ہو جانے والا خواب
تمھارے پاس تو نہیں؟
میرے ہمسائے کے بچوں کا خواب
گھروں میں بیٹھی جوان لڑکیوں کے خواب
شہر سے ہجرت کر جانے والے سارے خواب
تمہارے پاس تو نہیں؟" (۱۱)

سیاہ رات کی علامت ان کے فکری شعور کا آئینہ ہے۔ زندگی اور اس سے وابستہ لوگوں کا رویہ ان کے ہاں بڑی وضاحت سے ملتا ہے۔

مانا یہ رات، رات سے بڑھ کر سیاہ ہے
پر کیا ہے وہ جو اس کے بھی اندر سیاہ ہے
نکلا ہے اس دفعہ عجب مہتاب وصل کا
روشن ہے وسط سے مگر باہر سیاہ ہے (۱۲)

"نیکوں سے خالی شہر" ان کی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس میں ۲۷ غزلیں، ۲۹ نظمیں جب کہ غیر ملکی شعرا کی ۱۰ نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کا سیاق وسباق یہ ہے کہ شاعر عوام کی حالت زار دیکھتا ہے تو غمگین ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ افلاس اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ طاقت ور طبقے نے کمزوروں اور بے کسوں کا استحصال کر رکھا ہے۔ اس صورت حال کو اشعار کی شکل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

کیا کہوں کتنا مجھے کون ہے کھانے والا
میں کہ ہوں گھر میں فقط ایک کمانے والا
صبح کو ہانک کے لے جاتے ہیں خرکار مجھے

گھر بلالیتا ہے شب کو کوئی تھانے والا (۱۳)

لیکن جاوید شاہین کا ''نیکوں سے خالی شہر'' نیکیوں کے امکان سے ہر گز خالی نہیں ہے۔ وہ عوام کی خوش حالی کے متمنی ہیں۔ وہ زمیں کی سلامتی اور اس پر رزق کی فراوانی کی دعا مانگتے ہیں لیکن ان کا یہ اعتقاد ہے کہ جب تک یہ زمین ظالم سامراج سے رہائی حاصل نہیں کر پاتی۔ عوام کی تقدیر بدلنے کے امکانات معدوم ہیں۔ چناں چہ وہ سب سے پہلے اس زمین کی رہائی کی دعا مانگتے ہیں:

میں نے دعا مانگی
زمین کی سلامتی کی
اس پر رزق کی فراوانی کی
درختوں کی پناہ گاہیں آباد ہونے کی
ہجرت کرنے جانے والے پرندوں کی واپسی کی
لیکن ان سب دعاؤں سے پہلے
میں نے دعا مانگی
زمین کی رہائی (۱۴)

پانچویں شعری مجموعے کا نام ''جاگتا لمحہ'' ہے۔ اس کا آغاز حمد سے کیا گیا ہے۔ اس میں ۲۱ نظمیں، ۲۴ غزلیں اور ۹ نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل مخلوط ہے اس میں نظموں اور غزلوں کو ملے جلے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں غیر ملکی شعرا کی نظموں کے تراجم ہیں۔ یہ مجموعہ جاوید شاہین کی زندگی کے واقعات و تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ جمہوریت کی بحالی، شفقت کی موت اور ماں کے گم ہونے پر جو نظمیں لکھیں وہ بھی اسی مجموعے کی زینت ہیں۔ شفقت کی موت پر لکھی جانے والی نظم ملاحظہ کریں:

دیکھتے ہی دیکھتے
جینے کی خواہش
اس کی آنکھوں میں ساکت ہو گئی
اسے خاک کے سپرد کرنے کے بعد
میں نے زندگی کی طرف دیکھا

اس کے پاس
میرے غم میں شرکت کرنے کے لیے
مجھے حوصلہ دینے کے لیے
کوئی وقت نہیں تھا(۱۵)

عدالتوں کی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ جرم کوئی اور کرتا ہے اور سزا کسی اور کو ملتی ہے۔ مثلاً:

وہ عدالت کس کی تھی ، وہ فیصلہ کیسے ہوا
بے گنہ تھا میں پھر حکم سزا کیسے ہوا (۱۶)

''عشق تمام'' جاوید شاہین کی شعری کلیات ہے۔ اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ مذکورہ بالا پانچوں شعری مجموعے اس کلیات میں شامل ہیں۔ اس میں وہ ایک عہد ساز شاعر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان کا پختہ لب و لہجہ اور انداز بیان ہمارے سامنے زندگی کی حقیقتوں کو واشگاف انداز میں بے نقاب کرتا نظر آتا ہے۔ جاوید شاہین کی یہی خوبی معاصر نثری نظم کو فکری وسعتوں اور نظری تجزیوں سے ہم کنار کرتی ہے۔ یہ شاعری ان کے عہد کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔
''دیر سے نکلنے والا دن'' جاوید شاہین کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں مجموعی طور پر ۳۴ نظمیں اور ۴۹ غزلیں ہیں۔ وہی اداسی، تنہائی، بے چینی اور تلخی جو جاوید شاہین کی شاعری کا خاصہ ہے ''دیر سے نکلنے والا دن'' میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں انھوں نے روایت اور کلاسیکی شاعری سے بھرپور استفادہ کیا ہے وہاں جدت سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی شاعری میں نئی اپج ہے۔ لطافت کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست ہے۔ انھوں نے جابجا اس مجموعے میں خواہشات کا اظہار کیا ہے اور سنہرے دنوں کے حصول کی خواہش زوروں پر نظر آتی ہے۔ مثلاً نظم ''یہ دن بھی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

میں سحر ہونے کے ساتھ
ڈھونڈتا رہتا ہوں وہ لمحہ
کہ جس سے
اک مکمل دن بنانا ہے مجھے

اس کا مصرف بھی دکھانا ہے مجھے
اور وہ لمحہ نہ ملنے پر یہ دن بھی
اس کے ہم صورت دنوں میں
پھینک آنا ہے مجھے (۱۷)

''دیر سے نکلنے والا دن'' کی سب سے واضح علامت ''خواب'' ہے۔ لیکن دوسری طرف شاعر اپنے خوابوں سے بے مراد بھی نظر آتا ہے کہ یہ خواب اسے جھوٹ کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ خیال کرتا کہ خوابوں سے انسان ایک لاحاصل چیز کے پیچھے بھاگتا ہے، مثلاً:

جو خاک میں ہے ملا ہوا سرِ راہ گلاب گرا ہوا
ذرا دیکھنا کہیں یہ نہ ہو ترا مرا خواب گرا ہوا
کہیں شب کی گدلی سی نہر میں یہ آب چاند ہے سرنگوں
کہیں میلی صبح کے جوہڑوں میں ہے آفتاب گرا ہوا
ترے پانیوں میں چمک تو ہے ترے پانیوں میں اثر نہیں
مجھے لگ رہا ہے کہ ان میں ہے کہیں اک سراب گرا ہوا (۱۸)

زیرِ نظر مجموعے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر موجودہ سیاسی اور سماجی حالات سے دل برداشتہ ہے لیکن فرار کا راستہ تلاش نہیں کرتا۔ وہ تلاش فرار کے بجائے تنہا ہی ان مسائل کا حل ڈھونڈنے نکل پڑتا ہے۔ وہ حالات کو بدلنے پر قادر تو نہیں لیکن انفرادی کوشش ضرور کرتا ہے۔ مثلاً نظم ''دیر تک سونے والا'' میں:

رواں ہوں یوں
کہ اپنی تیز رفتاری سے
خود ہی ڈر رہا ہوں میں
بہت پہلے
مجھے جو کام کرنے تھے
انھیں اب کر رہا ہوں میں (۱۹)

"ہوا کا وعدہ" جاوید شاہین کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اکہتر غزلیں اور پانچ نظمیں شامل ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بھی ان کی غزل اتنی ہی تازہ ہے جتنی اس وقت تھی جب انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا۔ غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نظم بھی منفرد انداز لیے ہوئے ہے پھر ان کے اس شعری مجموعہ میں محض عشقیہ شاعری ہی نہیں بلکہ اس عہد کے سے اسی اور سماجی ماحول کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ عشقیہ شاعری کے حوالے سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

جس بے رحم کی آنکھوں سے چرانی ہے شراب
دست سفاک سے اک جام مجھے لے نا ہے (۲۱)

وہ اک کہانی مری گم شدہ محبت کی
لکھی گئی نہ کبھی ایک باب سے آگے
وہ مجھ سے خوش نہ تھا اپنی کسی ستائش پر
میں اور کہتا اسے کے اگلاب سے آگے (۲۲)

اسی طرح نظم "میری شاعری" کا یہ اقتباس جس میں غمِ دوراں کا ذکر ملتا ہے۔

جب کہیں کوئی گولی چلتی ہے
تو وہ سے دھی میرے دل میں لگتی ہے
میری شاعری میرا رومال ہے
جس سے میں اپنا اور دوسروں کا
خون سے صاف کرتا رہتا ہوں
یہ میرا ہتھیار ہے
جس سے میں زمینوں اور آسمانوں کے
منظر کھولتا رہتا ہوں
کوئی بھی میرے لیے بھید نہیں رہتا (۲۴)

انتظار حسین جاوید شاہین کی شاعری کے حوالہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک وقت میں ہم نے جاوید شاہین کا خیر مقدم اس طور پر کیا تھا کہ اردو غزل کے نئے مشعل برداروں میں ایک اور مشعل بردار شامل ہو گیا۔ اس وقت غزل نے روایتی رنگ سے ہٹ کر ایک نئی کروٹ لی تھی اور ایک نئے طرز احساس کی حامل بن گئی تھی۔ جاوید شاہین کی غزل اسی حوالے سے پہچانی گئی۔۔۔ جاوید شاہین کو پہلے تو اس پر داد ملنی چاہیے کہ اس کی غزل کی مشعل اسی طرح روشن ہے۔ گزرتے زمانے اور ادلتے بدلتے سے اسی سماجی حالات کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا یہ فیض ہے کہ آج بھی اس کی غزل اتنی ہی تازہ ہے جتنی اس وقت تھی جب اس نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس دوران اس نے ایک قدم اور اٹھایا کہ غزل کے ساتھ نظم میں بھی اظہار شروع کیا۔ یہاں بھی اس کا انداز دوسروں سے جدا ہے دونوں جگہ اس نے مروجہ شاعرانہ اسالیب سے کنارہ کر کے سے دھی سچی زبان میں سہولت اور سادگی سے بات کرنے کا ایسا اسلوب وضع کے اہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دلوں میں اتر جاتی ہے۔ پھر یہ شاعری نہ خالی عشقیہ شاعری ہے اور نہ محض عہد کے سے اسی سماجی ماحول کی عکاسی ہے دونوں نمونوں کو انسانی درد و غم کی مختلف صورتوں میں قبول کے اگے اہے اسی دوطرفگی میں جاوید شاہین کی انفرادےت پنہاں ہے۔''(۲۳)

حنیف رامے ان کی راست گوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

جاوید شاہین کی شاعری سے مجھے سچ کی خوشبو آتی ہے اس نے وہی کچھ کہا جو اس پر بے تا ہے اور جسے اس نے سچا پایا ہے۔ یہ سچ میٹھا تو نہیں ہے بس کھٹا میٹھا ہے یا پھر کڑوا ہے۔(۲۴)

جاوید شاہین سچ اور راست باز شخص تھے۔ انھوں نے کبھی سچی بات کو کسی مفاد کی خاطر قربان نہیں کیا۔ اس حوالے سے انھیں ملازمت کے دوران بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوتا رہا لے کن اپنے نظریات سے نہ ہٹے۔ آخر ۱۹۸۰ء میں انھیں ملازمت سے جبری ریٹائر کر دیا گیا۔ وہ نظریاتی طور پر سوشلزم کے حامی تھے اور جاگے ردارانہ نظام کے خلاف تھے۔ سوشلزم سے ان کی وابستگی آخری دم تک قائم رہی۔ ان نظریات کی جھلک ان کی شاعری میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں۔

میری شاعری کا بڑا حصہ میرے بائیں بازو کے نظریات کی ترجمانی کرتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ سماجی ناانصافی اور اقتصادی استحصال کا یہی واحد حل ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا نظریہ نہیں آیا جو سوشلزم کی جگہ لے سکے۔ (۲۵)

جاوید شاہین نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر جس بے باکی سے تبصرہ کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ عوام کے شاعر تھے اور انھوں نے عوامی مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ قنوطی شاعر نہیں بلکہ ان کی شاعری میں رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں جذباتی سطح پر ہر قاری کو متاثر کرتی ہیں اور جذبات کی ایک تیز رو قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے وہ محسوسات کے شاعر تھے اس لیے ان کی شاعری براہ راست دل کو متاثر کرتی ہے۔ مثلاً:

بھاؤ گرنے سے سر بازار ارزانی میں ہوں
میرا ترا جاوید شاہین سخت ویرانی میں ہوں
جسم میرا اس کی چادر میں کہیں چھپتا نہیں
اس کے گھر کی چاردیواری میں، عریانی میں ہوں (۲۶)

جاوید شاہین نے اپنی شاعری میں صرف انسانی دکھوں اور مسائل ہی کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کائنات کے اسرار و رموز کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ فطرت سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں فطرت پسندی سے زیادہ فطرت فہمی کا عمل نمایاں ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مظاہر کائنات کو تسخیر کرنے کا درس دیتے ہیں مثلاً:

وہم سے دور اور گماں سے پرے
آسمان اک ہے آسمان سے پرے
جس کا کوئی فلک بنا ہی نہیں
اک زمین اور ہے یہاں سے پرے (۲۷)

شاعری میں زبان و بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ زبان جتنی سادہ، صاف اور سلجھی ہوئی ہو گی شعر اتنا ہی دل پر اثر کرے گا جاوید شاہین کی شاعری کی زبان بھی قاری کو بطور خاص اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی فکر اور زبان دونوں سطحوں پر جمالیات کا گہرا شعور موجود ہے۔ انھوں نے نے

ہر خیال، ہر واردات اور ہر صورت حال کے لیے صاف، شستہ، سلیس اور تخلیقی زبان استعمال کی ہے اور سے دھے سادے الفاظ میں مدعا بے ان کیا ہے۔ درج ذیل اشعار سے زبان کی روانی اور سلاست کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فارغ اتنا بیٹھا ہوں
دن بس گنتا رہتا ہوں
ایک بڑی تنہائی میں
ٹوٹتا ہوں اور جڑتا ہوں (۲۸)

تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی شعر کو موثر بنا دیتا ہے۔ تشبیہات کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ شاعری کی جان ہوتے ہیں اور شعر کی تزئین کا کام کرتے ہیں۔ ان کا استعمال کم و بیش تمام شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ جاوید شاہین نے بھی اپنی غزلوں میں انھیں عمدگی سے برتا ہے۔ انھوں نے بڑی خوب صورت اور برمحل تشبیہات استعمال کی ہیں۔ یہ تشبیہات ٹھوس حقائق سے بھری ہیں۔ جاوید شاہین نے ان کو چلتی پھرتی متحرک زندگی سے کشید کیا ہے۔

ہوئی پھر سے وہ تر فضا شام کی
کہ گہری بہت ہے گھٹا شام کی (۲۹)

وہ شاید جوانی ہی تھی جب میاں
پٹاخہ تھا دن پھلجھڑی رات تھی (۳۰)

جو تری جوانی کا داغ ہے مرے پاس بس یہ وہ چراغ ہے
سرِشام گھر میں جلا لیا ہوئی شب تو بام پر رکھ دیا (۳۱)

خواب، دن اور روشنی کے استعارے ان کی شاعری میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ اشعار دیکھیں:

بستر خواب میرا کس نے بدل ڈالا ہے
جس پر لیٹا تھا میں تھا نرم بچھونے والا (۳۲)

دے کھا تھا کہیں شہر اک شاداب تھا کتنا
پر کتنی حقیقت تھی وہ اور خواب تھا کتنا (۳۳)

ہنر کی کارگر سے شے عجب نکل آئے
میں دن بناتا رہا اور وہ شب نکل آئے (۳۴)

ایک وہم آنکھ کا تھا ہوا مشکلوں سے دور
دے کھا ہے روشنی کو مگر ہے دلوں سے دور (۳۵)

اس طرح نظم ''دن سے میرا وعدہ''، جس میں دن کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

اتر کر رات سے
جب دن مرے کمرے میں آتا ہے
مجھے آکر جگاتا ہے
میں اس سے وعدہ کرتا ہوں
کہ اس کو رائیگاں ہونے کے ڈر سے
دور رکھوں گا

مگر جب شام کو
دن اپنے ہی اندر سمٹتا ہے
وہ میری سمت نکلتا ہے
اور اس کے خالی ہاتھوں میں
مری وعدہ خلافی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا (۳۶)

جاوید شاہین نے قدیم اور کلاسیکی شعری تکنیک سے ہٹ کر ایک نئے انداز کا تجربہ کیا ہے جو نئے اسلوبیاتی و موضوعاتی پہلوؤں سے ہمیں روشناس کراتا ہے انھوں نے مادی زندگی کے پر پیچ روابط پر نظر

رکھ کر اپنے شعور کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ من کے دائرے میں موضوع اور معروض کا فرق کم سے کم رہ گیا ہے۔ فرد کے جذبات سماج کے صحت مند جذبات بن گئے ہیں اور فرد کا شعور سماج کا شعور نظر آنے لگا ہے۔ ان کی شاعری میں کسی کو نہ تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انفرادی جذبات اور تجربات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور نہ یہ کہ شعور کے دروازے بند کر کے صرف جسم کی پکار پر کان لگا دیے گئے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر ان کی شاعری میں معتدل فضا نظر آتی ہے۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں:

جاوید شاہین کی شاعری متعدد حوالوں کی بنا پر بے حد منفرد اور قابل توجہ ہے۔ اس کے لیے شعری طرز احساس اور اسلوب نے ہم عصر اردو شاعری کی تخلیقی جہتوں میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعے سے وہ تھکن پیدا نہیں ہوتی جسے ہم عموماً انسانی صورت حال کے منفی ادراک سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اس کی شاعری ہمارے اندر آزادی اور رہائی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جاوید شاہین بنیادی طور پر سماجی اور سیاسی شعور رکھنے والا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں ایک ایسی کڑواہٹ موجود ہے جو ایک روشن مستقبل سے ناامیدی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک تخلیقی نسل کا المیہ ہے کہ جو خوب صورت دنیا کا خواب اس نے دیکھا تھا وہ اسے دھوکہ دے گئی۔[۳۷]

الغرض جاوید شاہین کی شاعری گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں سے اسی مضامین، معاشرتی پہلو، کائنات کے مشاہدات، استعارات، تشبیہات، اشارات و تلمیحات، علائم و رموز اور زبان و بیان کی ایسی خوبیاں ہیں جو انھیں بیسویں صدی کے کلاسیکل شعرا میں ایک الگ اور منفرد پہچان دیتی ہیں لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس عظیم شاعر کو وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ حق دار تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

مشہور ہونے کے کچھ ایک گر اور طریقے ہوتے ہیں جن میں پی آر سرفہرست ہے۔ پھر مشاعروں میں باقاعدہ شرکت اور ٹی وی پروگراموں میں شامل ہو کر لوگوں کے سامنے رہنے سے شہرت کمانے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ میری بدقسمتی ہے کہ ایک ذاتی خامی لکنت کے باعث میں مشاعروں میں زیادہ شریک نہیں ہوتا اور اس خامی کی وجہ سے ٹی وی پر ظاہر ہونے کا موقع بھی کم ہی ملتا ہے۔ پبلسٹی کے ان دو بڑے ذرائع سے فائدہ نہ اٹھاسکنے کے بعد شہرت کی خواہش کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔[۳۸]

کشور ناہید بھی جاوید شاہین کے نامقبول ہونے کا سبب ان کی لکنت کو ہی قرار دیتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

ہکلاہٹ نے جاوید شاہین کو بہت کمپلیکس میں مبتلا کیا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا شاعر ہے مگر اسے احساس تھا کہ جو شہرت دیگر شاعروں کو مشاعرے پڑھ کر اور ٹی وی پر آ کر ملی ہے اس سے زیادہ شہرت کا وہ حق دار تھا۔[۳۹]

جاوید شاہین صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک کامیاب نثر نگار بھی تھے۔ جاوید شاہین بطور نثر نگار اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں ''میرے ماہ و سال'' آپ بیتی ''ایک دیوار کی دوری'' ناول اور ''خوشی کی تین طرفیں'' ناولٹ اور افسانے شامل ہیں۔

''میرے ماہ و سال'' جاوید شاہین کی یادداشتوں کی ایک ایسی دنیا ہے جس میں صرف ان کی ذاتی زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں بلکہ ان کے آس پاس کے ادبی ماحول کی عکاسی بھی ہے۔ اس کتاب کے اندر جذبوں کے سانس لیتے ہنگاموں، شخصی وارداتوں، اجتماعی رویوں، سماجی زوال اور سیاسی اتھل پتھل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ''میرے ماہ و سال'' ایک شخص اور ایک عہد کی تاریخ ہے۔ اس میں واقعاتی دلچسپی بھی ہے اور شاعرانہ تخیل و تصور بھی یہ واقعات اور یادوں کا ایک مخزن ہے جو قاری کی دلچسپی کو اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے۔

یادداشتوں کو سچ کے قریب تر رکھنے کے لیے جس جرأت رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ جاوید شاہین کی شخصیت میں موجود تھی۔ جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' کو اردو ادب میں ایک بے باک اور جرأت مندانہ خود نوشت کے حوالے سے شہرت حاصل ہے لیکن اگر جاوید شاہین کی ''میرے ماہ و سال'' کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی صاف گوئی اور غیر منافقانہ اظہار کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کی اس خود نوشت میں ایسے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں جن کے بے ان میں نہایت دیدہ دلیری اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً رنڈیوں کے ساتھ تعلق کے حوالے سے انھوں نے جو واقعہ بیان کیا ہے اسے ملاحظہ کریں:

رنڈیوں کے کچھ کوٹھے بڑی سڑک سے ہٹ کر ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بھی تھے۔ وہاں سٹریٹ لائٹ نہ ہونے کے سبب اندھیرا رہتا تھا۔۔۔ میں نے ایک جگہ سائیکل کھڑی کی اور چادر کی بکل کی اوٹ سے نیم روشن دروازوں میں کھڑے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ آخر ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی مجھ سے عمر میں خاصی بڑی ہو گی۔ رنگ صاف اور بدن بھرا ہوا۔ چھاتیاں باہر کو نکل رہی تھیں جنہیں دیکھ کر میرے اندر کھلبلی مچنے لگی۔ اس کے قریب گیا تو مجھے دیکھ کر مسکرانے

لگی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پیار بھری شرارت تھی شاید میری کم عمری پر ہنس رہی تھی۔ چارپائی پر بیٹھ کر وہ اپنے کپڑے اتارنے لگی۔ جوں ہی اس نے انگیا بدن سے الگ کی اس کی سفید سفید چھتیاں باہر کو لپکنے لگیں اس کا بدن ابھی تک سڈول تھا رانوں پر گوشت کی دوہری تہ چڑھی ہوئی تھی۔ بستر پر لیٹ کر اس نے کمبل اوڑھ لیا۔۔۔ میں بھی کپڑے اتار کر کمبل میں گھس گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ پھر میں نے کیا کرنا تھا جو کچھ کیا اس نے کیا جیسے مدت کی رکی ہوئی تھی۔۔۔ (۴۰)

اس طرح جاوید شاہین نے "سیتا کی آغوش" اور "شاعری سے ملاقات" ماسٹر کلیم والا واقعہ کے عنوان سے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ نہایت دل گردے کا کام ہے جنھیں بیان کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے تمام تر واقعات کو نہایت صداقت سے بیان کیا ہے اور اس کے انجام کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے اپنے خاندان کے افراد کا ذکر کرتے ہوئے بھی سچ کا ساتھ دیا ہے اور کسی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔ اپنی ماں کو ضدی اور مغرور عورت کہا ہے جس کا رویہ اپنے شوہر اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ درست نہیں ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

میری ماں شروع ہی سے خود سر تھی۔ اس نے نانا کی تحصیل داری اور گورنری کا زمانہ دیکھا تھا۔ جس نے اسے بد دماغ اور مغرور بنا دیا تھا۔ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ نانی اپنی سوتیلی بیٹی سے بڑی تنگ تھی۔ اس نے خود سر اور مغرور بیٹی سے چھٹکارا پانے کے لیے شوہر کی موت کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کی شادی کر دی۔ لیکن یہ شادی چل نہ سکی۔ جلد ہی طلاق ہو گئی۔۔۔ طلاق کے بعد باپ کے گھر واپس آنے پر بیٹی زیادہ بد مزاج ہو گئی تھی وہ گھر پر اپنا حق ضرورت سے زیادہ جمانے لگی تھی۔ اٹھتی بیٹھتی سوتیلی ماں سے الجھتی رہتی۔ بھاوج کو ایک پل چین سے بیٹھنے نہ دیتی۔ بات بات پر اسے ڈانٹ دیتی۔۔۔ (۴۱)

باپ کے بارے میں جاوید شاہین لکھتے ہیں کہ وہ ایک عام سا آدمی تھا۔ ماں کے مزاج میں جتنی گرمی تھی باپ کی طبیعت اتنی ہی ٹھنڈی تھی۔ اس نے مکمل طور پر خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔

میرا باپ ایک عام سا آدمی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک عام سے آدمی کی زندگی بھی عام ہی ہو گی اس نے مکمل طور پر خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ رکھا تھا۔ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے بھی ان کے استعمال کی

ضرورت محسوس نہ کرتا ان لوگوں میں سے تھا جو ساحل پر کھڑے موجوں کو بنتے ٹوٹتے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ اسے کوئی ملنے نہ آتا اور نہ وہ کسی کو ملنے جاتا۔ پولیس میں رہ کر بھی دفتر میں کام کرنا پسند کرتا تھا۔ دفتر سے آکر کبھی گھر سے باہر نہ نکلا۔ ملازمت میں اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس لیے ایک ہی عہدے پر رکا رہا۔ میری ماں کے پاس اس کے لیے طعنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہا کرتی کہ ماتحت اپنے افسروں کے گھر جاتے ہیں۔ ان کے لیے نذرانے لے جاتے ہیں۔ ضرورت کے وقت خوشامد بھی کر لیتے ہیں۔ اب کوئی گھر آکر تمھیں ترقی دینے سے رہا، کیسے مرد ہو، گھر کا بلا بنے بیٹھے رہتے ہو۔

جاوید شاہین نے ''میرے ماہ و سال'' میں نہ صرف اپنے اور اپنے خاندان کے افراد کے بارے میں صاف گوئی سے کام لیا ہے بلکہ اپنے دوست احباب کا ذکر کرتے ہوئے بھی کسی لگی لپٹی سے کام نہیں لیا۔ زیرِ بحث کتاب میں معروف اور غیر معروف لوگوں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ ان میں شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مصور، ماہر نفسیات ماہر اقتصادیات، اداکار، موسیقار، استاد، دانش ور، صحافی، سیاستدان اور بیوروکریٹس سبھی شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے درمیان جاوید شاہین کے شب و روز گزرے لیکن کچھ شخصیات ایسی تھیں مصنف جن کے بہت زیادہ قریب تھے ان میں ناصر کاظمی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، استاد امانت علی خان، حبیب جالب، فیض احمد فیض، کشور ناہید، یوسف کامران، زاہد ڈار اور منو بھائی شامل ہیں ''میرے ماہ و سال'' میں جاوید شاہین نے ان کو نمایاں جگہ دی ہے۔ اس کتاب کی وساطت سے جہاں ان شخصیات کی جدوجہد زندگی کا علم ہوتا ہے وہاں ان کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ مصنف کی یہ کاوش قابل قدر ہے کہ انھوں نے اپنے دوست احباب کا ذکر کرتے ہوئے جہاں ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہاں ان کی خامیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً جب وہ منو بھائی کا خاکہ بیان کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

وہ بنیادی طور پر ایک امن پسند اور شریف النفس انسان ہے۔ لڑائی جھگڑے اور دھول دھپے سے دور رہنے والا۔ کوئی اس سے زیادتی بھی کر جائے تو خاموشی سے پی جاتا ہے۔ انتقامی کارروائی اس کا شعار نہیں۔۔۔[۴۳]

اسی طرح بچوں سے منو بھائی کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

بچوں سے منو بھائی کی محبت انتہا تک پہنچی ہوئی ہے وہ راہ چلتے ہوئے بچے کو پیار کرنے لگتا ہے۔ پردیس میں بھی اس کا یہی معمول ہے۔ مائیں خوشی اور حیرت کے جذبات کے ساتھ اسے دیکھتی رہتی ہیں۔

میرے گھر آتا ہے تو میری دونوں پوتیوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہے۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ دیارِ غیر سے ان کے لیے فراک اور دوسری چیزیں لانا نہیں بھولتا۔ (۴۴)

منو بھائی کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کا ذکر کرتے جاوید شاہین لکھتے ہیں:

ساری خوبیوں کے باوجود منو بھائی میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ وہ نا قابل اعتبار بھی ہے اور وعدہ فراموش بھی۔ جہاں تک اس کے وعدے کا تعلق ہے، غالب شاید اس کے بارے میں کہہ گیا تھا ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا۔ اسے اپنے لفظوں کا پاس نہیں رہتا۔۔۔ دوستی کے معاملے میں بھی اس کی سنجیدگی محل نظر ہے۔ آپ ہی اس سے ملتے رہیں تو دوستی ہے ورنہ وہ خود یہ زحمت کم ہی گوارا کرتا ہے۔۔۔ (۴۵)

ہمارے سوانح نگاروں کا سب سے بڑا مسئلہ یمین و یسار کا تذبذب ہے اور وہ سوانح عمریوں میں عموماً جھوٹ بولتے ہیں لیکن جاوید شاہین نے کبھی بھی صداقت کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھوں نے اپنے ماہ و سال کا احاطہ جس طرح کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا اسے نہایت ایمان داری سے بلا کم و کاست بیان کر دیا اور اس پر انھیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔

عمران نقوی نے ایک انٹرویو میں جب آپ سے پوچھا:

آپ نے "میرے ماہ و سال" میں اپنے متعلق اپنے والدین اور دوستوں کے بارے میں جو سچ اگلا ہے اس پر کبھی پچھتاوا تو نہیں ہوا؟

اس کا جواب دیتے ہوئے جاوید شاہین نے کہا:

بالکل نہیں! ہمارے ہاں جو سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں، ان میں نصف سے زیادہ جھوٹ ہوتا ہے اور بہت سی سچائیوں کو بیان کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اپنے بارے میں سبھی باتیں بتانے سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ شاید یہ ہماری مشرقی روایات کا تقاضا ہے۔ میں نے اپنی یادداشتوں میں مصلحت پسندی سے گریز کیا ہے۔ جب میں اپنے اور اپنے والدین کے بارے میں صاف گوئی سے کام لینے سے باز نہیں آیا تو اپنے دوستوں کو کیسے معاف کر دیتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اچھائی اور برائی ہر شخص

میں ہوتی ہے۔ کوئی بھی فرشتہ نہیں ہوتا۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں کا ذکر نہ کرتا اور تصویر کا فقط ایک ہی رخ دکھاتا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے "میرے ماہ و سال" کو مقبولیت بخشی کیوں کہ اردو کی یہ پہلی سوانح عمری تھی جس میں ہر بات کو کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ (۴۶)

شفقت تنویر مرزا "میرے ماہ و سال" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "Javed Shaheen's candid and courageous treatment of some very delicate episodes of his own life, his parents and of his friends makes "Mairey Mah-o-Sall" a new addition in urdu literature."(47)

جاوید شاہین بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی جھلک "میرے ماہ و سال" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں ان کی دس نظمیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پابلو نرودا کی ایک نظم کا اقتباس اور دیگر شعرا کی غزلوں کے اشعار بھی حوالے کے طور پر درج ہیں۔ اسی طرح کتاب میں دیے گئے عنوانات میں شاعرانہ انداز اپنایا گیا ہے مثلاً وہ میرا آشیانہ، شاعری سے ملاقات، دخترِ رز سے یارانہ، وہ شہر کہاں چلا گیا، قصہ میری شادی کا، گرم نگہ، نرم لب آدمی، تنہائی کا لاڈلا، سر کی دنیا کا شہزادہ، وہ ہم زبان میرا اور ہوس سے رو تماشا وغیرہ۔ یوں یہ کتاب نظم و نثر کا حسین مرقع نظر آتی ہے یوسف کامران کی موت پر جاوید شاہین نے جو نظم لکھی اسے ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی "میرے ماہ و سال" میں موجود ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

شہرِ دل سے جو چلو جانب صحرائے بلا
فاصلہ کتنا ہے اے دوست بتا!
کون سے لمحے زمین روکے گی
کس جگہ یاد کوئی ٹوکے گی
کیا وہ آنگن کی مہک ساتھ مرے جائے گی
پھر کہاں سے وہ مجھے موڑ کے لے آئے گی
کس قدر ریت مجھے خوں میں ملانی ہو گی
اور جلتی ہوئی بے رحم ہوا کی گٹھڑی
دور تک کے سے اٹھانی ہو گی (۴۸)

"میرے ماہ و سال" ایک دلچسپ تصنیف ہے اس میں جابجا مزاح کے چشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں اور قاری کسی قسم کی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ مثلاً:

ایک رات وہ (زاہد ڈار) اور سلیم شاہد رے گل بار سے اٹھ کر دال چاول کھانے لکشمی چوک چلے گئے۔ وہاں اپنی حماقت سے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ حماقت بھی ایسی کہ یقین نہ آتا تھا۔ ایک آوارہ گائے کو پکڑنے اور دوہنے کی کوشش کرنے لگے۔ سپاہی دونوں کو پکڑ کر تھانہ قلعہ گجر سنگھ چل پڑا۔ راستے میں سلیم شاہد سپاہی کو بار بار کہتا جارہا تھا۔

> ''، ''شاہ جی! جانے دیں آپ کے بچے ہیں'' تنگ آکر سپاہی نے اس سے پوچھا کہ اسے کے سے پتا چلا کہ وہ شاہ ہے۔ سلیم شاہد نے جواب دیا کہ وہ اپنے گھر کے جمعدار کو اسی نام سے پکارتا ہے۔ سپاہی نے غصے میں اس کے سر پر دھول جمائی اور دونوں کو تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ صبح یوسف کامران نے دونوں کی ضمانت کروائی۔''[۴۹]

"میرے ماہ و سال" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا اسلوب بے ساختہ اور برجستہ ہے۔ اس کی زبان اس قدر سادہ اور شگفتہ ہے کہ قاری کو دوران مطالعہ ارد گرد کا ہوش نہیں رہتا۔ اس کا طرز تحریر اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ پوری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھنے کے بعد ہی دم لیتا ہے۔ درج ذیل پیرا گراف سے زبان کی سادگی اور سلاست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پھر پانی سر سے گزرنے لگا۔ بات بات سے آگے نکلنے لگی۔ پہل یوسف کے طرف داروں سے ہوئی۔ ثریا اپنے بھائی کو یوسف ثانی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے حسن پر بڑا ناز تھا وہ خود بھی سارے بڑے گورے چٹے اور تیکھے نین نقش والے تھے۔ کشور ان کے درمیان کیسے جچتی، وہ تو اسے نظر بٹو سمجھتے تھے۔ نند کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کر دیتی تھی کہ بھائی نے کہاں جھک ماری تھی۔ کشور کی عام صورت اس کے لیے ایک طعنہ بن گئی۔ ایک جوان لڑکی کے لیے اس سے بڑی ہتک کیا ہو گی۔ وہ سب کچھ سنتی مگر خاموش رہتی کہ ابھی اس کے خاموش رہنے کے دن تھے کوئی دوسرا راستہ سامنے نہیں تھا۔ وہ اتنی جلدی جگ ہنسائی کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔[۵۰]

بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ "میرے ماہ و سال" کا نثری اسلوب غیر تخلیقی ہے۔ عمران نقوی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اس اعتراض کا دفاع کرتے ہوئے جاوید شاہین نے کہا:

"میرے ماہ و سال" پر کوئی پندرہ کے قریب انگریزی، اردو اخبارات ورسائل نے تبصرے شائع کیے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک کتاب پر تبصرے کم ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ مزے کی بات ہے کہ کسی ایک تبصرہ نگار نے بھی اس کتاب کی نثر کو غیر تخلیقی ہونے کا کہیں اشارہ نہیں دیا بلکہ ہر ایک نے زبان کی شگفتگی اور اسلوب کی بے ساختگی کی داد دی ہے۔ بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ کتاب کے طرز تحریر نے انھیں اس قدر گرفت میں لے لیا کہ پوری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔(۵۱)

خالد احمد "میرے ماہ و سال" کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "A riverting account of our times by a poet who writes a new prose style. The test was that I finish the book in one sitting, not believe me, becouse of the scandles but because of readability and newnewss of style."(52)

درج بالا خصوصیات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "میرے ماہ و سال" جاوید شاہین کی ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے۔ اس کا شمار اردو ادب کی بہترین خود نوشتوں میں ہوتا ہے۔ واقعات کی صداقت اور زبان و بیان کی چاشنی نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ بے شک ہمارے جیسے غیر محفوظ معاشرے میں سچ بولنا نہایت مشکل کام ہے لیکن یہ کتاب بعد میں آنے والوں کو حوصلہ اور رہنمائی فراہم کرتی رہے گی۔

جاوید شاہین کی دوسری نثری تصنیف ان کا ناول "ایک دیوار کی دوری" ہے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے فرقان کی زندگی کے ایک دردناک حادثے کو قلم بند کیا ہے۔ اس ناول کے ذریعے انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے نوجوان جو اعلیٰ تعلیم یا بہتر روزگار کے لیے مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں، وہاں جا کر شادیاں کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے مغربی دنیا کا غلام بنا لیتے ہیں۔ خوشگوار زندگی کے جو خواب اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ سب کے سب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

شادی ایک خوب صورت بندھن ہوتا ہے اگر اس کی بنیاد سچائی پر رکھی جائے تو یہ بندھن کبھی نہیں ٹوٹتا لیکن اگر اس کی بنیاد جھوٹ اور دھوکے پر رکھی جائے تو یہ بندھن ایک کچے دھاگے کی مانند ثابت ہوتا ہے۔ جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔ اس ناول میں بھی کچھ ایسے ہی کھوکھلے بندھن کا ذکر کیا گیا ہے یہ ناول ساجدہ (ماں) اور خرم (بیٹا) کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ ساجدہ خرم کی شادی مانڑیال

(کینیڈا) میں ایک پاکستانی لڑکی حمیرا اسے کر دیتی ہے۔ حمیرا خرم سے چھ سال بڑی ہے لیکن اس کے والدین اس بات کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ شادی کی رات خرم پر جب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے اور حمیرا کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ شادی کی بنیاد چونکہ جھوٹ پر استوار تھی اس لیے یہ زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور ایک بچے کی پیدائش کے بعد میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ خرم اس واقعہ کا ذمہ دار اپنی سوتیلی ماں (ساجدہ) کو ٹھہراتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ سوتیلی ماں نے تحقیق کے بغیر اس کی شادی کی تاکہ چھٹکارا پا سکے۔ اس بات پر ماں اور بیٹے کے درمیان دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف ساجدہ جو خرم سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور اپنے بچوں سے بڑھ کر اسے چاہتی ہے، اپنے آپ کو ان سب باتوں کا قصوروار تصور کرتی ہے۔ علیحدگی کے بعد خرم ایک امیگرین لڑکی ''فاطمہ'' سے ملتا ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب فاطمہ کو پتہ چلتا ہے کہ خرم اور اس کی بیوی کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے تو وہ اسے یہ کہتے ہوئے چھوڑ دیتی ہے کہ مانٹریال میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو اپنے سے بڑی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں اور خوش حال زندگی گزارتے ہیں۔ فاطمہ کے بعد خرم ایک فرنچ لڑکی سمعون سے اپنے تعلقات بڑھاتا ہے لیکن وہ بھی اس کا ساتھ نہیں دے پاتی اور اسے چھوڑ دیتی ہے۔

کسی بھی کہانی میں کرداروں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کرداروں کے بغیر کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ کردار ہی کسی کہانی کی تعمیر و تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ناول ''ایک دیوار کی دوری'' حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے کردار جاوید شاہین کی حقیقی زندگی میں موجود ہیں۔ صرف انھوں نے ان کے نام تبدیل کر دیے ہیں۔ آپ بیتی ''میرے ماہ و سال'' کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں جاوید شاہین نے اپنے بڑے بیٹے فرقان کی ازدواجی زندگی کے متعلق جو خامہ فرسائی کی ہے وہ ہمیں اس ناول میں بھی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں فرقان کا کردار خرم نے ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے آپ بیتی میں اپنی دو شادیوں کا جو تذکرہ کیا ہے اور شفقت (جاوید شاہین کی پہلی بیوی) کی موت کا احوال بیان کیا ہے وہ بھی ہمیں اس ناول میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ کرداروں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ شفقت جو آمنہ کے نام سے کردار کو نبھا رہی ہے، کی موت کا احوال ملاحظہ کریں:

جب آمنہ آخری سانس لے رہی تھی تو اس وقت مسعود اور خرم کے سوا کوئی اس کے قریب نہیں تھا۔ وہ اسے ہسپتال سے گھر لے آیا تھا۔ ایک مسلسل غنودگی اس پر چھائی رہتی تھی۔ جب کبھی آنکھیں کھولتی تو خرم کو اپنے پاس لانے کے لیے کہتی۔ پھر اس کی بے جان آنکھیں بیٹے پر جم جاتیں اور اس وقت تک جمی رہتی، جب تک وہ دوبارہ نیم بے ہوشی کی حالت میں نہ چلی جاتی تھی۔(۵۳)

یوں تو ناول "ایک دیوار کی دوری" کے تمام کردار بہت اہم ہیں مگر دو کردار ایسے ہیں جن پر ناول کی پوری عمارت کھڑی ہے یعنی ساجدہ (ماں) اور خرم (بیٹا)۔ ان دو کرداروں نے اس ناول میں جان ڈال دی ہے۔ ناول نگار نے ساجدہ کو ایک باہمت خاتون کے طور پر ظاہر کیا ہے جو اپنے شوہر کی جدائی کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے اور اپنے راستے میں آنے والی تمام مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ شوہر کے چلے جانے کے بعد وہ اپنے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیتی ہے۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے اور انھیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی۔ ہر کردار ناول کی تعمیر و تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ قاری جب ساجدہ کے کردار کو پڑھتا ہے تو اسے فوراً اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ ساجدہ کے کردار میں دراصل جاوید شاہین نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

"One can see that Javed Shaheen has abandoned himself in the character of Sajida and has written the moral from a detached perspective but his personal impact is present every where."(54)

اس ناول میں خرم ساجدہ کے بیٹے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ خرم ساجدہ کے شوہر مسعود کی پہلی بیوی سے ہے جو کینسر جیسی لاعلاج بیماری سے انتقال کر جاتی ہے۔ خرم پاکستان سے ایم اے کا امتحان پاس کرتا ہے اور مزید تعلیم کے لیے باہر جانے کا خواہش مند ہے۔ ساجدہ خرم کے کینیڈا جانے کا بندوبست کرتی ہے اور اس کی شادی وہیں مانٹریال میں حمیرا نامی ایک پاکستانی لڑکی سے کر دیتی ہے تاکہ وہاں پر سکون رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ ناول نگار نے خرم کے کردار پر خاصی توجہ دی ہے۔ یہ کردار ہمارے ان پاکستانی نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاتے ہیں اور پھر وہاں شادی کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے مغربی دنیا کا غلام بنا لیتے ہیں۔ جاوید شاہین کی کردار نگار اس اعتبار سے

انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں کرداروں کے نفسیاتی پہلو ابھرتے ہیں۔ ان کی باطنی کیفیات سے بھی ہم آشنا ہوتے ہیں۔

مکالمہ نگاری اس ناول کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ جاوید شاہین کو مکالمہ نگاری میں مہارت حاصل ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست اور جملوں کی چستی و اختصار کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مکالموں کو پر تاثیر بنانے کے لیے کن امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ساجدہ اور فرحان کے مابین یہ مختصر سا مکالمہ ملاحظہ کریں۔

''ماں جی مجھے ایک سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے'' فرحان نے ماں کو سوچ میں گم دیکھ کر کہا:

''کیسا سرٹیفکیٹ؟'' ساجدہ نے پوچھا۔

''آپ کی مالی استطاعت کے بارے میں'' فرحان نے کہا

''تمھارے بھائی کے لیے تو اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔''

''ان کا معاملہ دوسرا تھا'' فرحان نے کہا ''میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا، وہاں جا کر اپنا کوئی انتظام کرلوں گا۔''

منظر نگاری کے حوالے سے اس ناول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ چونکہ شاعر بھی ہیں اس لیے ان کی منظر نگاری میں شاعری کی چاشنی اور رنگینی دونوں موجود ہیں۔ وہ اپنی شاعرانہ فطرت کے سبب منظر کو حقیقی ہی نہیں تخیلاتی اور تصوراتی آنکھ سے بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً:

اب دھوپ بالکل غائب ہو چکی تھی اور اندھیرا آہستہ آہستہ اترنے لگا تھا۔ سامنے پھیلے ہوئے شہروں میں روشنیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر کر ڈھلوان سڑک پر چلنے لگا۔ اتوار کی شام میں سڑک ویران پڑی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ جس سے سردی اس کے بدن میں سرایت کر رہی تھی۔۔۔ (۵۶)

اس ناول میں جزئیات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ امر گہرے مشاہدے کا متقاضی ہوتا ہے۔ ناول نگار کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے اور وہ ہر چیز کو اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ مثلاً جب خرم کے کمرے کا ذکر کرتا ہے تو اس کی ایک ایک چیز کو بیان کر دیتا ہے۔

بیڈ شیٹ تو جیسے ایک عرصے سے تبدیل نہیں ہوئی تھی اور میل سے بھری ہوئی تھی۔ تکیہ چڑمڑا پڑا ہوا تھا۔ دو کرسیاں تھیں جس پر خرم کی قمیض اور پتلونیں پڑی تھیں، چھوٹا سے کچن تھا۔ سنک

میں چند برتن پڑے تھے۔ ایک کونے میں فریج دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں بالکل ننگی تھیں۔ ایک دیوار پر کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی جس پر کوئی پردہ نہیں تھا۔(۵۷)

ناول نگاری میں زبان و بیان اور اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس حوالے سے اگر جاوید شاہین کے ناول "ایک دیوار کی دوری" کو دیکھا جائے تو اس میں سلاست و روانی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی زبان سادہ اور برجستہ ہے۔ مثلاً:

رابعہ کے چلے جانے کے بعد ساجدہ کو محسوس ہوا جیسے وہ دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ فرحان نے ماں کی تنہائی کو کبھی ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے شب و روز پہلے جیسے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔(۵۸)

ناول نگار نے بعض جگہوں پر شاعرانہ زبان استعمال کی ہے۔ مثلاً:

دل کا کوئی موسم ایسا ہوتا ہے جو اپنا رخت سفر کھول کر ضرورت سے زیادہ قیام کرنے لگتا ہے۔ اداسیوں کا موسم بھی کچھ اسی طرح باجی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا اور اپنا زرد رنگ ہر طرف بکھیر رہا تھا۔(۵۹)

جاوید شاہین کی تیسری نثری کتاب "خوشی کی تین طرفیں" ہے۔ یہ کتاب ایک ناولٹ "ایک اور جوا" اور پانچ افسانوں "خوشی کی تین طرفیں"، "ایک حقیقت کا اعتراف"، "جان دادی"، "ماں اور بیٹیاں" اور "تہہ طوفاں" پر مشتمل ہے۔ یہ کہانیاں ٹوٹتے بکھرتے خاندانی نظام اور انسانی رشتوں کے دکھوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ تین کہانیاں لندن اور امریکہ کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں سرمایہ داری نظام کے تحت بننے والے معاشروں کی خباثتوں اور منافقتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

ناولٹ "ایک اور جوا" میں جاوید شاہین نے اپنے ایک بیٹے کی زندگی کے مسائل بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی انتہائی سادہ ہے۔ اس میں جاوید شاہین بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ اپنے بیٹے کو امریکہ بھجواتے ہیں، کس طرح اس کی شادی ہوتی ہے اور پھر کیسے اس کی ازدواجی زندگی خراب ہوتی ہے۔ "خوشی کی تین طرفیں" میں آفتاب، عادل اور آصف کی ناکام ازدواجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی کا راوی خود مصنف ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو ملنے امریکہ جاتا ہے اور وہاں جا کر ان کے حالات سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایک بیٹے کی ازدواجی زندگی اس کے سامنے خراب ہوتی ہے۔ زیر نظر کہانی میں ایک باپ کے دکھ کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسے باپ اپنی بدنصیبی کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ کن

امیدوں سے تینوں کو باہر بھیجا تھا۔ سب اس پر رشک کرتے تھے۔ اولاد کے لائق نکلنے پر اسے خوش قسمت کہتے تھے۔ اس نے ان پر اپنی ساری کمائی لگا دی تھی۔ باپ سے ورثے میں ملی ہوئی کچھ زمین بھی بیچ دی تھی۔ اس ساری محنت کا اسے یہ پھل مل رہا تھا۔۔۔ باپ کو دکھ تو اس کا تھا کہ انسانی تعلقات اور بھائی چارے کی کتاب انھوں نے نہ جانے کس طاق میں رکھ دی تھی۔ باپ کی برگشتگی کی اب یہ حالت تھی کہ اس نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اب اسے کسی کے فون کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ایک لحاظ سے اس کے بیٹے ضائع ہو گئے تھے۔[۶۰]

''ایک حقیقت کا اعتراف'' میں جاوید شاہین نے اپنی ماں کے گم ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ان کی والدہ ایک روز بہو سے جھگڑ کر گھر سے ایسے گئی کہ دوبارہ لوٹ کر نہ آئی۔ اس کہانی میں اس صورت حال کو نام اور مقامات بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں ایک بیٹے کی کسک کو بیان کیا گیا ہے جس کی ماں کھو جاتی ہے۔ افسانہ ''جان دادی'' میں جاوید شاہین نے اپنی دوسری بیوی مسرت کی دُکھ بھری داستان بیان کی ہے کہ وہ اپنے سوتیلے بیٹے سے کتنا پیار کرتی ہے اس کا اپنی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتی ہے، لیکن بیٹا چھوٹی ماں کو قبول نہیں کرتا اور ہر موقع پر اس سے بد تمیزی کرتا ہے۔ بیٹے کی زیادتی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ دراصل افسانہ ''جان دادی'' میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دو شادیاں کرنے سے کیسے کیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''تہیہ طوفاں'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک پاکستانی عورت کے احساس محرومی کو بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ رفعت اپنے شوہر کے ساتھ بیری (انگلینڈ) میں رہتی ہے۔ گھر کا کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری ہے۔ بعض اوقات اسے دکان پر بارہ بارہ گھنٹے کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ گھر کو بنانے میں اس کا بہت کلیدی کردار ہے لیکن اتنے جتن کے باوجود اس کا پرس ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ بینک میں تمام رقم اس کے شوہر کے نام ہے۔ اس کا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے گھر کا خرچ تک اس کا شوہر اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز اپنے ہاتھ سے خریدتا ہے۔ پیسے کے معاملے میں وہ رفعت پر اعتبار نہیں کرتا۔ وہ اپنے طور کوئی چیز نہیں خرید سکتی۔ اگر کسی چیز کو اس کا شوہر ناپسند کر دیتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ کبھی اصرار نہیں کرتی۔

رفعت شوہر کی اس بد سلوکی کو خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے۔ اس کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے۔ لیکن یہ لاوا اس وقت آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ جاتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ

اس کا شوہر کسی اور عورت میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ اسے دورے پڑنے لگ جاتے ہیں۔ آخر جب دورے شدت اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا شوہر اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دیتا ہے۔ زیر نظر افسانے میں افسانہ نگار نے بیرون ملک پاکستانی خواتین کے مصائب و الم کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

ان کے افسانوں میں ''کہانی پن'' بھرپور انداز میں ملتا ہے جاوید شاہین کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہماری روز مرہ زندگی کے بہت قریب ہیں کہیں بھی ہمیں غیر فطری انداز یا حقیقت سے دوری کا تاثر نہیں ملتا۔ ان کی کہانیاں زندگی کے واقعات ومشاہدات پر مبنی ہیں۔ ان کے تمام کردار ہمارے ارد گرد موجود ہیں اور ہم اپنی روز مرہ زندگی میں شناخت کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاں علامت اور تجرید کا نام ونشان نہیں ملتا۔ جاوید شاہین کے ہاں مکالمے چست اور منظر نگاری خوب صورت ہے۔

جاوید شاہین کے افسانے اپنے فنی تقاضوں کے لحاظ سے مختصر یا طویل ہوتے ہیں۔ ان میں ''جان دادی'' جیسا مختصر افسانہ بھی شامل ہے جو صرف آٹھ صفحات میں مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس ''تہیہ طوفان'' جیسا نسبتاً طویل افسانہ بھی موجود ہے۔

حیرت اور دلچسپی کا عنصر ایک کامیاب افسانے کے لیے لازمی ہوتا ہے اور جاوید شاہین کے ہر افسانے میں ہمیں یہ عنصر وافر مقدار میں ملتا ہے۔ مثلاً افسانہ ''ایک حقیقت کا اعتراف'' میں احمد کا اپنی ماں کے گھر سے چلے جانے کے بعد پریشان ہونا اور پھر اطمینان کا اظہار کرنا، اس طرح افسانہ ''جان دادی'' میں فاطمہ کا چھٹی کے بعد اپنی ہم جماعت کے گھر چلے جانا اور اپنے گھر جانے سے انکار کر دینا قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

جاوید شاہین ہر ہر فقرے پر قاری کی دلچسپی بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کلائمیکس واضح ہوتے ہیں اور ان کا افسانہ ہر اچھے افسانے کی طرح کلائمیکس پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے افسانوں کا انجام کسی نہ کسی غیر متوقع موڑ پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ افسانہ ''ماں اور بیٹیاں'' میں منزہ غیر متوقع طور پر لاہور والی کوٹھی فروخت کر کے واپس امریکہ چلی جاتی ہے اور وہاں ایک کینیڈین شخص کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔

جاوید شاہین ایک اچھے شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ وہ ایک عمدہ مترجم بھی تھے۔ انھیں زمانہ طالب علمی ہی سے ترجمہ نگاری کا شوق تھا۔ اس دوران انھوں نے دو عظیم انگریزی ناولوں کا اردو میں

ترجمہ کیا۔ ایک ناول آندرے ژید کا "Strait is the gate" تھا جب کہ دوسرا ترگنیف کا "A house of folk" تھا۔ جاوید شاہین نے اول الذکر کا نام "دروازہ تنگ ہے" اور دوسرے کا نام "آشیانہ" رکھا لیکن بد قسمتی سے ان کے دونوں ترجمے شائع نہ ہو سکے۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

پہلا ترجمہ کلاسیک کے پاس فروخت کیا اور دوسرا مکتبہ جدید کے پاس میری بد قسمتی یہ ہے کہ دونوں ترجمے شائع نہ ہو سکے۔ کلاسیک کو ایک زمانے میں آگ لگ گئی۔ میرے ترجمے کا مسودہ بھی اس میں بھسم ہو گیا۔ مکتبہ جدید کے حصے بکھر گئے۔ آشیانہ کا مسودہ حفیظ چودھری کے حصے میں آیا۔ اس نے نہ جانے اسے کہاں گم کر دیا۔ (۶۲)

جاوید شاہین کو شعری اور نثری دونوں تراجم پر مکمل عبور حاصل تھا۔ شروع میں ان کے تراجم "نصرت" اور "ادبِ لطیف" میں بھی شائع ہوتے رہے۔ وہ سوشلزم کے حامی تھے اور مغرب کے ترقی پسند شعرا سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے ترقی پسند غیر ملکی شعرا کی نظموں کو اردو کا روپ دیا۔ یہ تراجم ان کے دو شعری مجموعوں "نیکوں سے خالی شہر" اور "جاگتا لمحہ" میں شامل ہیں۔ "نیکوں سے خالی شہر" میں سات غیر ملکی شعرا کی دس نظموں کے ترجمے ہیں جب کہ "جاگتا لمحہ" میں آٹھ غیر ملکی شعرا کی نو نظموں کا ترجمہ موجود ہے۔ جاوید شاہین نے ان دونوں شعری مجموعوں میں جن غیر ملکی شعرا کی نظموں کا ترجمہ پیش کیا ہے ان میں ہر من ہیسے، پابلو نرودا، اوکتاوَپاز، جارج سفیرس، ہربرٹوپاڈیلا، میریں سورسکو، کوفی ایوونور اور برتول بریخت کا نام شامل ہے۔

"نے کیوں سے خالی شہر" اور "جاگتا لمحہ" میں شامل تراجم کے علاوہ جاوید شاہین نے آٹھ غیر ملکی شعرا کی نظموں کے ترجمے کا انتخاب "سہ پہر کی دھوپ" کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کتاب میں سی پی کوافی کی ستائیس نظمیں، ہر من ہیسے کی پانچ، پابلو نرودا کی چھ، جارج سفیرس کی دو، اوکتاوَپاز کی چار، اوڈیئس ایلی ٹس کی تین، جوزف براڈسکی کی دو اور ہربرٹوپاڈیلا کی نو نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ جاوید شاہین اس انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں نے اس انتخاب میں مغرب کے آٹھ سربر آوردہ شاعروں کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان شاعروں میں یونانی بھی ہیں، جرمن اور روسی بھی۔ تین شاعروں کا تعلق وسطی اور جنوبی امریکہ سے ہے۔ یہ شاعر مجھے پسند ہیں کیوں کہ ان کی شاعری نہ

صرف مجھے اکساتی ہے بلکہ خود میری ذات میں شعر کا جو سرچشمہ ہے اس میں طرح طرح کے ذائقے ملاتی جاتی ہے۔ میں انھیں پڑھ کر ان کا کلام ترجمہ کر کے اپنے آپ کو اور بھی توانا محسوس کرتا ہوں۔ یہ انتخاب جدید مغربی دنیا کی اعلیٰ پائے کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔"(۶۳)

جاوید شاہین نے شعری تراجم کے علاوہ نثری تراجم بھی کیے ہیں۔ انھوں نے انگریزی مضامین اور کتب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے جن نثری کتابوں کے ترجمے کیے ہیں ان میں لیون ٹراٹسکی کی آپ بیتی "My life" کا ترجمہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ "میری زندگی" کا نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب لیون ٹراٹسکی کی ابتدائی زندگی کی یادداشتوں سے شروع ہو کر ۱۹۲۹ء میں ملک بدری کے المیے تک کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے ٹراٹسکی کی یہ تصنیف انگریزی ادب میں اپنا خصوصی مقام رکھتی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اپنی اشاعت کے وقت سے تاحال اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے روسی انقلابات، کے مونسٹ انٹرنے شنل کی تشکیل وترویج اور سٹالن ازم کے مقابلے میں اشتراکیت کا زبردست دفاع، ان سب عظیم واقعات کے تناظر میں یہ کتاب ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو زبان وادب کا دامن اس شان دار کتاب سے خالی تھا۔ جاوید شاہین نے اس کا ترجمہ کر کے اردو ادب کو ایک وقیع تحفہ دیا ہے۔

لال خان اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"، "میری زندگی" صرف ایک فرد کی سوانحہ عمری نہیں ہے بلکہ انقلاب اور رد انقلاب کی ایک ایسی داستان ہے جس سے آج کی نسل بہت کچھ سے کھ سکتی ہے۔ جتنی بڑی یہ کتاب ہے اس کا اتناہی بڑا ترجمہ جاوید شاہین نے کیا ہے۔ ٹراٹسکی کی شاعرانہ تحریر کی روح اور احساس کو جاوید شاہین نے ایک انقلابی اور بلند پایہ منفرد شاعر ہونے کے ناطے اپنے ترجمہ میں زندہ رکھا ہے۔"(۶۴)

"میری زندگی" کے علاوہ جاوید شاہین کے نثری تراجم میں "قومی سوال اور مارکسی بین الاقوامیت" (ٹینڈ گرانٹ / ایلن وڈز / اور لال خان)، "سرمایہ داری کے داخلی تضادات" (ماروزے تنگ)، "تعلیمات ماوزے تنگ"، (ماوزے تنگ) "مانیں نہ مانیں" (ڈیل کارنگی)، "کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں" (ڈیل کارنگی)، "۳۹ بڑے لوگ" (ڈیل کارنگی)، "گفتگو اور تقریر کا فن" (ڈیل کارنگی)،

''شیر آیا شیر آیا''(جم کاربٹ ر کے نتھ اینڈرسن)، ''ردر پریاگ کا آدم خور''(جم کاربٹ)، ''ہندوکش کے قبائل''(جون بدلف) اور ''سی آئی اے کی سیاہ کاریاں''(ڈیوڈ وائز ر تھامس بی راس) شامل ہیں۔

''قومی سوال اور مارکسی بین الاقوامیت'' ٹے ڈگرانٹ، ایلن وڈز اور لال خان کے فکر انگیز مضامین پر مشتمل ہے۔ جو انھوں نے سرمایہ داری نظام اور سامراجی استحصال کے پس منظر میں تحریر کیے ہیں۔ منو بھائی لکھتے ہیں:

> ''سرمایہ داری نظام اور سامراجی استحصال نے قومی سوال کو فلسطین سے کشمیر اور آئرلینڈ سے یوگوسلاویہ تک عالمی سطح پر سب سے زیادہ انسانی خون بہانے والا مسئلہ بنا دیا ہے۔ ایلن وڈز، ٹیڈ گرانٹ اور لال خان مارکسی بین الاقوامیت اور سوشلزم کے طبقاتی شعور کی روشنی میں اس مسئلہ کے مصنفانہ حل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ بربریت سے بچاؤ کا واحد راستہ سوشلزم ہے۔''(۶۵)

ماؤزے تنگ کے علاوہ جاوید شاہین نے امریکی ماہر نفسیات ڈیل کارنے گی کی چار کتابوں کے تراجم کیے ہیں۔ ان میں پہلی کتاب ''مانیں نہ مانیں'' ہے جس میں ڈیل کارنے گی نے اڑتالیس نامور افراد کی زندگی کے حیرت انگیز واقعات درج کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین ''نصرت'' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ''کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں'' میں پینتالیس کامیاب شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح ''بڑے لوگ'' بھی شخصیات کے بارے میں ہے۔ مجموعی طور پر ان تینوں کتابوں میں ایک سو چونتیس افراد کے بارے میں حیرت انگیز اور دلچسپی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ''گفتگو اور تقریر کا فن'' ڈیل کارنگی کی چوتھی کتاب ہے جسے جاوید شاہین نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ فن تقریر کے بارے میں ہے۔ مسز ڈورتھی کارنگی زیرِ نظر کتاب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''اس کتاب میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جن کی مدد سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد مقصد حیات پانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے میں نے محسوس کیا ہے کہ کس طرح خوف و ہراس پر قابو پا کر خود اعتمادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ عملی طریقوں اور تجویزوں کے ذریعے سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح کسی فرد یا افراد کو گفتگو یا تقریر سے قائل اور متاثر کیا جا سکتا ہے۔''(۶۶)

جاوید شاہین نے انگریزی زبان کی سیاسی اور نفسیاتی کتب کے علاوہ شکاری کہانیوں کی کتابوں کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے اس حوالے سے ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک کا نام ''شیر آیا شیر آیا'' ہے۔ اس کتاب کے مصنف جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن ہیں۔

شکاریات کے حوالے سے جاوید شاہین کے ترجمے کو دوسری کتاب ''ردرپریاگ کا آدم خور'' ہے۔ اس کے مصنف جم کاربٹ ہیں۔ اس کتاب میں ایک آدم خور چیتے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو ۱۲۵ انسانوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ اس کتاب میں جم کاربٹ نے آدم خور چیتے کو تلاش کرنے اور اسے ہلاک کرنے کی داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جاوید شاہین کے تراجم کی ایک اور اہم کتاب ''ہندوکش کے قبائل'' ہے۔ جون بدلف نے ۱۸۵۰ء میں یہ کتاب اس وقت لکھی جب وہ گلگت میں ہندوستانی حکومت کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ اس کتاب میں اس نے کوہ ہندوکش کے مشرقی علاقوں کے باشندوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بڑے مخصوص انداز سے پیش کیا ہے۔ مصنف اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کو میں نے ہر طرح سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں جن علاقوں میں گیا وہاں کے باشندوں کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی زندگیوں کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مجھ سے پہلے کسی اور مصنف نے یہ کوشش نہیں کی ہو گی۔''(۶۷)

جون بدلف کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ آج سے سوا سو سال پہلے کوہِ ہندوکش کے مشرقی علاقوں کے باشندوں کی زندگی کے بارے میں حیرت انگیز معلومات فراہم کرتی ہے۔ جاوید شاہین نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا بلکہ کتاب کی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے کچھ ردوبدل سے کام لیا ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''، ''ہندوکش کے قبائل'' ایک ایسی دستاویز ہے جسے اگر لفظ بہ بلفظ ترجمہ کیا جاتا تو یہ اپنی بہت سی دلچسپی کھو بیٹھتی۔ لہٰذا اس کی دلچسپی برقرار رکھنے کے یے جہاں ضروری سمجھا گیا اس میں تھوڑا بہت ردوبدل کر دیا گیا ہے۔ اس سے کتاب کی اصل روح کو کہیں گزند نہیں پہنچا۔ عام قاری بھی اسے سفر نامے کے طور پر پڑھ کر مزا لے سکتا ہے۔''(۶۸)

جاوید شاہین کے ترجمے کی آخری کتاب ''سی آئی اے کی سیاہ کاریاں'' ہے اس کے مصنف ڈیوڈ وائز اور تھامس بی راس ہیں۔ اس میں پوشیدہ حکومت (CIA) کی تاریخ کا کھوج لگایا گیا ہے کہ اسے کس

طرح صدر ٹرومین نے قائم کیا اور یہ کس طرح صدر آئزن ہاور، صدر کے نڈی اور صدر جانسن کے تحت کام کرتی ہے۔

جاوید شاہین نے جتنے بھی تراجم (شعری اور نثری) کیے ہیں ان میں یہ قدر مشترک ہے کہ وہ سلیس، رواں اور صاف ہیں۔ انھوں نے انگریزی اصلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اردو، فارسی اور عربی زبان سے مدد لی ہے اور انگریزی اصلاحات کا صحیح نعم البدل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض کتابوں کا لفظ بہ بلفظ ترجمہ کرنے سے گریز کیا ہے اور کتاب کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے تھوڑا بہت ردوبدل سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ''ہندو کش کے قبائل'' کا ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے یہی انداز اپنایا ہے۔

درج بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاوید شاہین ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر، عمدہ نثر نگار اور بہترین مترجم تھے ادب کی ترویج و ترقی میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اردو شاعری (غزل اور نظم) کو مروجہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے نئے امکانات سے متعارف کرایا، نئی کروٹ دی اور اسے نئے طرز احساس سے روشناس کرایا۔ گزرتے زمانے اور ادلتے بدلتے سیاسی سماجی حالات کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا سکھایا۔ انھوں نے مروجہ شاعرانہ اسالیب سے کنارہ کر کے سیدھی سچی بات میں سہولت اور سادگی سے بات کرنے کا ایسا اسلوب وضع کیا ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دلوں میں اتر جاتی ہے۔ پھر یہ شاعری نہ خالی عشقیہ ہے اور نہ محض عہد کے سیاسی و سماجی ماحول کی عکاس ہے۔ دونوں غموں کو انسانی دردو غم کی مختلف صورتوں میں قبول کیا گیا ہے اس دوطرفگی میں ان کی انفرادیت پنہاں ہے۔

جاوید شاہین شاعری کی طرح نثر میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو نثر کو تخلیقی اسلوب اور نئے موضوعات عطا کیے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جن واقعات و مسائل کا ذکر کیا ہے۔ وہ پہلے کسی ادیب کی توجہ کا مرکز نہیں بنے۔ یہ شرف جاوید شاہین ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار ان مسائل کو اردو ادب میں متعارف کرایا۔ انھوں نے اپنے ذاتی غم میں دوسروں کے دکھ کو محسوس کیا۔ جاوید شاہین کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر میں سچ اور حقیقت بیان کرنے کی روایت ڈالی۔ انھوں نے واقعات کو جس جرأت اور بے باکی سے بیان کیا ہے اس کے پہلے کہیں نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی تصویر کا محض ایک رخ پیش کیا ہے۔ جہاں انھوں نے کسی کی خوبیاں بیان کی ہیں وہاں خامیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔

حواشی

۱۔ منو بھائی، آخری نظم کا پیش لفظ، بحوالہ، جاوید شاہین ، عشق تمام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۹۵

۲۔ ایضاً

۳۔ جاوید شاہین، عشق تمام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲

۴۔ ایضاً، ص ۲۴

۵۔ ایضاً، ص ۳۹

۶۔ محولہ بالا، ص ۹۵۔۹۶

۷۔ حسن رضوی، ڈاکٹر، خیالات، لاہور: گورا پبلشرز ۳۵، لوئر مال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۶

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، (اٹھائیسواں ایڈیشن) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص ۶۵۳

۹۔ محولہ بالا ۳، ص ۱۲۴۔۱۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۳۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۴۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۱۴

۱۷۔ جاوید شاہین، دیر سے نکلنے والا دن، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۔۴۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۰۔ جاوید شاہین، ہوا کا وعدہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۲۳۔ جاوید شاہین، فلیپ، ہوا کا وعدہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۲۴۔ جاوید شاہین، فلیپ، دیر سے نکلنے والا دن، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء

۲۵۔ جاوید شاہین، میرے ماہ و سال، لاہور: فکشن ہاؤس، اشاعت سوم، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۵۱

۲۶۔ محولہ بالا ۳، ص ۲۳۸

۲۷۔ محولہ بالا ۱۷، ص ۱۰۸

۲۸۔ محولہ بالا ۲۰، ص ۹۸

۲۹۔ محولہ بالا ۱۷، ص ۱٦۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷٦

۳۱۔ محولہ بالا ۲۰، ص ۱۴۵

۳۲۔ محولہ بالا ۳، ص ۳۸۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۵۴۸

۳۴۔ محولہ بالا ۲۰، ص ۲۵

۳۵۔ محولہ بالا ۳، ص ۲٦۰

۳٦۔ محولہ بالا ۱۷، ص ٦۸۔٦۹

۳۷۔ محولہ بالا ۲۴

۳۸۔ عمران نقوی، شرف ملاقات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اگست ۲۰۰٦ء، ص ۱۲٦

۳۹۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ٦۲

۴۰۔ محولہ بالا ۲۵، ص ۳۹۔۴۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۴۳۔ ایضاً، ۱۳۹

۴۴۔ ایضاً، ۱۴۰

۴۵۔ ایضاً، ۱۳۸

۴٦۔ محولہ بالا ۳۸، ص ۱۲۹

۴۷۔ جاوید شاہین، فلیپ، میرے ماہ و سال، لاہور: فکشن ہاؤس، اکتوبر ۲۰۰۳ء

۴۸۔ محولہ بالا ۲۵، ص ۱۰۴، ۱۰۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۶۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۴

۵۱۔ محولہ بالا ۳۸، ص ۱۳۰

۵۲۔ محولہ بالا ۴۷

۵۳۔ جاوید شاہین، ایک دیوار کی دوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۳۷

۵۴۔ ڈاکٹر افضل مرزا، The dawncluture shackes، ۲ جنوری ۲۰۰۱ء

۵۵۔ محولہ بالا ۵۳، ص ۹۱

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔۱۰۷

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۸۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۶۰۔ جاوید شاہین، خوشی کی تین طرفیں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴، ص ۸۶

۶۱۔ جاوید شاہین، فلیپ، مخوشی کی تین طرفیں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء

۶۲۔ محولہ بالا ۲۵، ص ۰۷

۶۳۔ جاوید شاہین، فلیپ، سہ پہر کی دھوپ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء

۶۴۔ لیون ٹراٹسکی، میری زندگی، مترجم: جاوید شاہین، لاہور: طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز، فروری ۲۰۰۴ء، ص ۱۶

۶۵۔ ٹیڈ گرانٹ / ایلن وڈز، فلیپ، قومی سوال اور مارکسی بین الاقوامیت، مترجم: جاوید شاہین، لاہور: طبقاتی، جدوجہد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۴ء

۶۶۔ ڈیل کارنگی، گفتگو اور تقریر کا فن، مترجم: جاوید شاہین، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء ص ۵۔۶

۶۷۔ جون بدلف، ہندوکش کے قبائل، مترجم: جاوید شاہین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۷